بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

انسانیت کے لیے اِس گھڑی سے زیادہ منحوس کوئی گھڑی نہ تھی جب اُس نے اپنی شیرازہ بندی کے لیے روحانی رشتوں کو یکسر نظر انداز کر کے مادی رشتوں کو بنیاد بنانے کی کوشش کی۔ انسانیت کا اصل جوہر روحانی اور اخلاقی ہے جب اس جوہر کو ناقابلِ التفات سمجھتے ہوئے اور انسانیت کے مادی عناصر کو اس کا حقیقی جوہر قرار دیتے ہوئے انسانوں کے اندر اجتماعی نظم قائم کیا جائے تو ان کے مابین تفریق اور منافرت کا پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اور اسے اس کے صحیح مرتبے اور مقام سے آشنا کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے جتنے انبیا علیہم السّلام بھی مبعوث فرمائے انہوں نے جس طرح اُسے بندگی رب کی دعوت دی اسی طرح اس کو یہ بھی بتایا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور یہ بات اس کے ذہن نشین کرائی کہ اس کا حقیقی جوہر اخلاقی و روحانی ہے اور اس بنا پر اس کی شیرازہ بندی کے لیے بھی اساس سب سے زیادہ موزوں اور اس کے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ان ہادیوں کے برعکس شیطان نے ہمیشہ رنگ، نسل، وطن، زبان، اور معاشی و معاشرتی طبقات جیسے مادّی رشتوں پر زور دیا اور انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انسانوں کی جتھہ بندی ایسی ہی مادی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔

دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب انسان اور انسان کے درمیان روحانی اور اخلاقی رشتے کمزور ہوئے تو پھر ان کی جگہ علاقائی، نسلی اور لسانی تعصبات نے زور پکڑا اور انسانیت کے وسیع تر تصور کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں کا تصور ابھرا۔ اس انقلاب کے لیے یوں تو تاریخ کے کئی ادوار کی نشاندھی کی جا

سکتی ہے، لیکن دورِ جدید میں فکر و نظر کی یہ غیر معمولی تبدیلی یورپ کی نشأۃ ثانیہ سے شروع ہوئی اور ابھی تک انسانیت انسان اور انسان کے درمیان انسانی اخوت کے رشتے کو قائم نہیں کر سکی۔

مسیحیت اگرچہ چودھویں اور پندرھویں صدی سے کافی پہلے بہت حد تک بگڑ چکی تھی اور اس میں یہ اخلاقی قوت باقی نہ رہی تھی کہ انسان کو مادیت کی یلغار سے محفوظ رکھ سکے، مگر ان ساری خامیوں کے باوجود اس نے اپنے ماننے والوں کے درمیان مذہب کی اساس پر اخوت کا ایک رشتہ قائم کر رکھا تھا جس کا وجود اس بات کی شہادت فراہم کر رہا تھا کہ انسان ابھی تک اخلاقی اور روحانی رشتوں کو خاک و خون کے اتفاقی اور مادی رشتوں سے مضبوط سمجھتا ہے۔ مگر نشأۃ ثانیہ کے بعد، جسے فی الحقیقت روحانیت پر مادیت کا تسلط کہا جا سکتا ہے، صورت حال بالکل بدل گئی۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے پوپ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دیا۔ مسیحیت ایک عالمگیر مذہب کے اونچے مقام سے گر کر قومی مفادات کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی۔ جس تحریک کو سادہ لوح عوام اصلاح مذہب کی تحریک سمجھتے ہیں وہ درحقیقت مذہب کی بالادستی ختم کرنے کے لیے مادہ پرستوں کی منظم سازش تھی۔ اس کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ صنعتی انقلاب نے لوگوں کے اندر دولت پرستی کا جو جنون پیدا کیا ہے اس کی راہ میں مذہبی رکاوٹوں کو ختم کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ہر قوم نے اپنے حالات کے مطابق اپنا الگ کلیسائی نظام قائم کیا، اپنی عبادات تک کی زبان قومی بنالی، اور قومی تقاضوں کے تحت مذہبی تعلیمات میں تغیر و تبدل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مذہب جلد ہی قومی مفادات کا آلۂ کار بن کر رہ گیا اور زندگی کے معاملات میں اس کا کوئی عمل دخل باقی نہ رہا۔ اس بنیادی تغیر کے بعد ہی مغرب میں نیشنلزم، سیکولرزم اور سرمایہ داری کے فتنے اٹھے اور پھر اشتراکیت آئی۔

اشتراکیت جسے قومی سرمایہ داری یا اجتماعی مادہ پرستی کہا جا سکتا ہے، اس نے بھی مذہب کو ختم کرنے کے لیے قریب قریب یہی حربے اختیار کئے ہیں۔ لیکن اس کے ان حربوں کی اثر آفرینی کا مسیحی دنیا میں اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کو خود مسیحیوں نے ایک بالکل بیکار سی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ اشتراکی اب وہاں اپنی مذہب دشمنی کے ارمان نکالنے کے لیے کچھ زیادہ مواقع نہیں پاتے۔ ان کی کوششوں کا ہدف

اب اسلام ہے اور وہ ہر جگہ اسلام کو دنیا کی سب سے زیادہ ناکارہ اور غیر موثر قوت بنانے کے درپے ہیں۔ اُن کی ان کوششوں کا اگر دقت نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں چار واضح رجحانات ملتے ہیں۔

سب سے پہلا رجحان جو اشتراکی تحریک میں صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ دین کی عالمگیر حیثیت اور اُس کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی برادری کے وجود کا خاتمہ ہے۔ اشتراکیت ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دنیا کی کوئی قوم زبان، رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود کو نظر انداز کر کے کسی اعتقادی اور اخلاقی و روحانی اساس پر اپنی قومیت کی تشکیل کرے۔ اس اساس کا وجود اشتراکیت کے لیے ناقابل برداشت ہے اور وہ اسے اپنے لیے ایک خوفناک چیلنج سمجھتی ہے۔ قومیت کا یہ روحانی اور اخلاقی تصور اشتراکیت کے بنیادی تصور سے مغائرت رکھتا ہے اور اس کا عملی وجود اس کے سارے فلسفے اور نظریے کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنا سارا زور اِسی تصور کو مٹانے پر صرف کرتی ہے کہ محض ایک روحانی اور اخلاقی رشتہ انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیوں کو جہاں بھی کام کرنے کے مواقع ملے ہیں انہوں نے وہاں مسلم قومیت کی اس وسیع اساس کو برباد کر کے، رنگ، نسل، علاقائی حدود اور مادی مفادات کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی صورت گری کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے قریب قریب ایک ہی نوعیت کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ مسلم آبادیوں کے اندر چل پھر کر یہ دیکھا جائے کہ دین کے علاوہ اور کون سی چیز ان کے اندر وجہ اشتراک بن سکتی ہے۔ اس کا اگر کہیں سراغ مل جائے تو پھر سارا زور اُس کی اہمیت اور افادیت ذہن نشین کرانے پر صرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مخصوص علاقے کے رہنے والے ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر ان کے نسلی تعصبات کو ابھارا جاتا ہے۔ اگر کہیں زبان کا رشتہ موجود ہو تو لسانی روابط پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر کہیں معاشی مفادات وجہ شکایت ہوں تو ان مفادات کے حق میں زوردار پراپیگنڈا کر کے انہیں شدید سے شدید تر کیا جاتا ہے۔ الغرض اسلام کے علاوہ جس رشتے کی بھی نشاندھی کی جاسکے اس رشتے کو ہی مسلم معاشرے کے اندر اسلام کے مقابلے میں ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ

دیکھیے اسلامی ممالک میں مسلم قومیت کے مقابلے پر ان سارے غیر اسلامی رشتوں کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے جنہیں اسلام نے جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور جنہیں اسلام دنیا سے بت پرستی کی طرح مٹانے آیا تھا۔ ان جاہلی تصورات کے نتیجے میں عرب اب اسلامی برادری کے علمبردار نہیں رہے بلکہ عرب قومیت کے علمبردار بن کر رہ گئے ہیں۔ اُن کے ہاں زبان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے اور اس طرح اسلام کی عالمگیر برادری عرب قومیت کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔

پھر ان ظالموں نے زبان کی بنیاد پر تشکیل پانے والی قومیت کو بھی برداشت نہیں کیا بلکہ ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں مزید انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتشار کی یہ صورت اتنی دردانگیز ہے کہ اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً سب سے پہلے زبان کی بنیاد پر عربی بولنے والی دنیا کو ملت اسلامیہ سے الگ کیا۔ اس میں شرق اوسط کے ممالک کے علاوہ مغرب اقصیٰ، زنجبار اور شمالی افریقہ کے بہت سے ممالک بھی آجاتے ہیں۔ پھر خاک وطن کی اساس پر اس میں مزید حصے بخرے ہوئے اور عربی بولنے والی دنیا بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد ان قومیتوں کے درمیان بھی رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا جھگڑا اٹھا دیا گیا اور عربوں کی ساری قوتیں ایک دوسرے ہی کی جڑ کاٹنے اور آئے دن اپنے ہی گھر میں انقلابات برپا کرنے میں لگ گئیں جس کے نتائج کو آج ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (عزت تو اللہ کے لیے ہے اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے) فرمایا ہے۔ لیکن عرب قومیت کے پرستار اسے عربوں کی میراث سمجھ رہے ہیں اور العزۃ للعرب کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اور ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ جس کلمے کو یہ لوگ آج اپنے لیے وجہ افتخار خیال کرتے ہیں وہ کفر ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے موقعوں پر بڑی صراحت کے ساتھ جاہلیت کا کلمہ کہا ہے اور جس نسل اور وطنی تفاخر کے بارے میں حضورؐ نے صاف طور پر کہا ہے کہ آپ انہیں مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔

اسلام کو چھوڑ کر دوسری مادی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کرنے کی سزا امت مسلمہ کو یہ مل رہی ہے کہ اس کے اندر انتشار در انتشار پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے زبان کی بنیاد پر اس نے اپنے آپ کو مختلف چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا۔ پھر خاک وطن سے تعلق کی بنیاد پر اس میں مزید تقسیم ہوئی۔ مگر دشمن اس انتشار پر بھی مطمئن نہ ہوا اس نے اس کے مزید حصے بخرے کرنے کے لیے اس میں لاتعداد نئے فتنے کھڑے کر دیے جن سے امت کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یکسر منتشر ہو کر رہ گئے۔

ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ زبان اور رسم الخط کا فتنہ ہے۔ کسی قوم کی علمی اور فصیح زبان محض اس کے بولنے والوں کے لیے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ اُن کے لاشعور میں ان کے دل پسند تصورات کی آبیاری بھی کرتی ہے۔ مسلم قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے انھوں نے مسلمانوں کے اندر علاقائی بولیوں اور عامی زبانوں کی ترویج و ترقی کی ایک خوفناک مہم شروع کر رکھی ہے۔ مثلاً عربی زبان کو ہی لیجیے۔ پہلے تو اس بنیاد پر عربی بولنے والوں کو پوری ملت سے الگ کیا گیا۔ مگر اس کے بعد انہیں یہ بات سُجھائی کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو فصیح عربی پڑھنے اور لکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ اس علاقائی بولی اور عام زبان سے مختلف ہے جو بچے بولتے ہیں۔ عامی زبان میں تعلیم دینے کا فائدہ انہیں یہ بتایا گیا کہ اس طرح طلبا کے ذہنوں پر بہت کم بوجھ پڑے گا اور دوسرے عوامی ادب جو دراصل کسی ملک کی ثقافت کی جان ہوتا ہے وہ تیزی سے نشوونما پائے گا۔

یہ سارے دلائل امت کو منتشر کرنے کے لیے بڑے شرمناک ہتھکنڈے ہیں۔ فصیح عربی اسلام کے پورے دینی علمی اور ادبی سرمائے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس زبان کی حفاظت اور اس کی ترویج و اشاعت سے دینی احساسات اور تصورات کو غذا ملتی رہتی ہے اور امت کا اپنے ماضی سے رشتہ استوار رہتا ہے۔ اس لیے اسلام دشمن طاقتیں ایک لمحہ کے لیے بھی امت مسلمہ کو باہم جوڑنے اور اسلام سے وابستہ رکھنے والی اس قوت کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس بنا پر دنیا کے ہر مسلمان ملک میں اس فتنے کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔

اسی زبان کے سلسلے میں دوسرا فتنہ رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ کسی زبان کا رسم الخط اس زبان کے ساتھ اور اس کے تہذیبی اور علمی پس منظر کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح معانی اور الفاظ کے پیکر کے مابین روح اور جسم کا سا تعلق ہوتا ہے بالکل اسی طرح رسم الخط اور الفاظ کے مابین ایک معنوی ربط پایا جاتا ہے جو رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ یکسر ٹوٹ جاتا ہے۔ حروف کی خارجی ہیئت انسان کے شعور اور لاشعور میں ایک خاص نوعیت کے تصورات اور احساسات کو ابھارتی ہے جن کی روشنی میں الفاظ کے پیکر میں معانی اور مطالب کے مخصوص رنگ بھرے جاتے ہیں۔ اس بنا پر دنیا کی ہر باشعور اور ہوشمند قوم نے اپنی تہذیب اور تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے رسم الخط کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس کی اُسی احساس ذمہ داری کے ساتھ حفاظت کی ہے جس کے ساتھ کہ نظریاتی بنیادوں کی محافظت کی جاتی ہے۔

امت کے اندر ذہنی اور عملی خلفشار پیدا کرنے اور اُسے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ایک اور فتنہ جسے مسلم ممالک میں بڑی شدومد کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے وہ جاہلی تہذیبوں کا احیاء ہے۔ ان ممالک کے اندر اسلام سے قبل جاہلی تہذیب و تمدن کے جتنے ناپاک مظاہر موجود تھے اور اس جاہلیت کے جتنے نمایاں علمبردار تھے انہیں کہیں تحقیق کے نام پر، کہیں قوم پرستی کے نام پر اور کہیں تاریخی روایات کے نام پر ابھار ابھار کر سامنے لایا جاتا ہے اور اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان اللہ کے دین، اس کی تہذیبی روایات اور اس کی نامور شخصیتوں سے قطع تعلق کر کے قبل از اسلام کی جاہلی تہذیبوں اور ان کے علمبرداروں کے ساتھ گہرا تعلق خاطر پیدا کریں۔ مصر میں فرعونی تہذیب، شمالی افریقہ میں قبل از اسلام کی بربری تہذیب اور پاکستان میں گندھارا آرٹ کی سرپرستی، سب جاہلی تہذیبوں کے احیاء کے مختلف شاخسانے ہیں۔

امت مسلمہ کو جاہلیت کا پرستار بنانے کے لیے لادین قوتیں جو متعدد حربے استعمال کر رہی ہیں ان میں ایک حربہ ثقافت کا بھی ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں یہ ثقافت ایک خوفناک طوفان کی صورت میں اٹھائی جا رہی ہے۔ اس نے نوخیز نسلوں کو خاص طور سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس خوفناک فتنے

کے برپا کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کے ذریعے امت کو دو طرف سے ضرب کاری لگائی جا سکتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو قوم کے اخلاق برباد ہوں گے اور اس اخلاقی بربادی کی وجہ سے یہ قوم دین اور اخلاقی نقطہ نظر سے کسی کام کی نہ رہے گی۔ اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اہل مغرب کی اخلاق سوز حرکات کی نقالی کرنے میں صرف ہوں گی اور اس طرح یہ امت مغربی تہذیب کے فسق و فجور کی وارث اور دنیا کی ساری برائیوں اور منکرات کی پوٹ بن کر رہ جائے گی اور یہ برائیاں اسے اندر ہی اندر ختم کر دیں گی۔

اس ثقافت کا اسلام دشمن طاقتوں کو دوسرا فائدہ یہ پہنچے گا . . کہ امت کے اندر خوفناک خلفشار پیدا ہو گا۔ ہر علاقے اور مقام کی الگ الگ ثقافت کو وہاں پر تسلّط اور برتری حاصل ہو گی اور اس طرح ایک ملک کے اندر رہنے والے مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک چیز بھی ایسی باقی نہ رہے گی جو انہیں فکری اور نظریاتی ہی نہیں، معاشرتی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔

اسلام دشمن قوتیں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کسی بڑی سے بڑی اخلاق سوز حرکت کے ارتکاب سے باز نہیں رہتیں۔ ان شیطانی قوتوں نے صدیوں سے بسی ہوئی خالص مسلم آبادیوں میں غیر مسلموں کو لا بسایا ہے اور مسلمانوں کو ان بستیوں سے جبراً نکال دیا ہے تاکہ ان کے اندر وحدت باقی نہ رہے۔ خالص مسلم آبادیوں کو مخلوط آبادیوں میں تبدیل کرنے کے لیے اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو مسلم اقلیت کے علاقوں میں بدلنے کے لیے سرخ اور سفید سامراج نے جو شرمناک کھیل کھیلے ہیں وہ تاریخ کی نہایت ہی عبرتناک اور المناک داستانیں ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد انسان کا انسانیت پر ہی سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے اور آدمی سوچتا ہے کہ کیا عدل و انصاف کے الفاظ محض اوہام ہیں جن کا عالم واقعات میں کوئی وجود نہیں۔ گذشتہ صفحات میں تو ہم نے ان حربوں کا محض تذکرہ کیا ہے جو امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے سفید اور سرخ سامراج برسہا برس سے استعمال کر رہا ہے۔ اب ہم ان ریشہ دوانیوں کے چند عملی مظاہر پیش کرتے ہیں جن سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان سے امت مسلمہ کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس

تفصیل سے پہلے ہم قومی وحدت کے بارے میں سرخ سامراج کے علمبرداروں کی اصول پرستی کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان لوگوں کے اصل عزائم کیا ہیں۔ انہیں مظلوم اور ستم زدہ قوموں سے کس قدر دلچسپی ہے اور چھوٹی چھوٹی بے بس قوموں کے بارے میں یہ کس نوعیت کے جذبات رکھتے ہیں اور انہیں ہڑپ کرنے کے یہ کس قدر حریص ہیں۔

روس میں جب اشتراکی انقلاب آیا تو وہاں کی قومیتوں کو یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا کہ اب جلد ہی امن عامہ کے لیے ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے گا جس میں تمام نوآبادیوں کی آزادی کا التزام ہو گا اور وہ ساری قومیں جو استبداد کا شکار ہیں یا انسانی حقوق سے محروم ہیں انہیں آزادی کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ مسلمانوں کو تو خاص طور پر دسمبر ۱۹۱۷ء کے اعلان کے ذریعہ اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کے عقائد، اور رواج، ان کے قومی اور تہذیبی ادارے ہر طرح محفوظ رہیں گے۔ مگر افسوس کہ یہ وعدہ ایک دن کے لیے بھی ایفا نہ ہو سکا۔ اشتراکی لیڈروں پر اچانک یہ راز افشا ہوا کہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں کا وجود اشتراکی نقطہ نظر سے بڑا خطرناک ہے اور انہیں جلد از جلد اشتراکی ریاست میں اس طرح مدغم کر دینا چاہیے کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ لینن نے ایک تقریر میں بڑے واضح الفاظ میں یہ کہا:

> "محنت کش طبقے کا مفاد اسی میں ہے کہ روس کی ساری قومیتوں کے مزدوروں کو محنت کشوں کی مختلف تنظیموں مثلاً سیاسی، پیشہ وارانہ، اور تعلیمی اداروں میں مدغم کر دیا جائے اور یہ ادغام اس کی جماعت کے تحت عمل میں آئے۔"

لینن کی یہ تقریر محض ایک رائے کا اظہار نہ تھی بلکہ یہ سرخ سامراج کی سیاسی پالیسی کا سنگِ بنیاد تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا الگ قومی وجود اشتراکیت کے لیے بالکل ناقابل برداشت ہے انہیں ملی اعتبار سے منتشر ہو کر اشتراکیت کی وسیع تر برادری میں شامل ہونا چاہیے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر انہیں دنیا میں جینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

جنوری ۱۹۱۸ء میں مسلمانوں کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لیے سٹالن کی صدارت میں قومیتوں کا ایک مامور یہ COMMISSARIAT OF NATIONALITIES قائم کیا گیا جس کے تحت تین تاتاری علماء کی زیر ہدایت مسلمانوں کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک الگ مامور یہ تشکیل ہوا۔ اس مامور یہ کا کام یہ تھا کہ تمام مسلم ریاستوں میں یعنی ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قرغیزستان اور قازقستان میں مسلمانوں کے اندر اشتراکی رجحانات کو راسخ کرنے کے لیے کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ جون ۱۹۱۸ء میں ملانور کی زیر قیادت مسلمان اشتراکیوں کی روسی جماعت معرض وجود میں آئی۔ یہ جماعت چند ماہ کے بعد توڑ دی گئی اور مسلمانوں کے تمام معاملات روسی کمیونسٹ پارٹی کی مسلمان تنظیموں کے مرکزی بیورو کو تفویض کر دیے گئے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں لفظ مسلمان کو مٹا کر اس ادارے کا نام اقوام مشرق کی تنظیم رکھا گیا۔ اس کے فوراً بعد "مسلمان مامور یہ" کو بھی ختم کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتراکیت کے علمبردار یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کا الگ قومی وجود کسی حیثیت سے بھی برقرار رہے۔ ان کے لیے مسلمان اشتراکیوں کی الگ جماعت کا وجود بھی ناقابل برداشت تھا۔

اشتراکیت کے اس اسلام کش طرز عمل کی وجہ ہم ان صفحات میں متعدد بار بیان کر چکے اور اس حقیقت کی صراحت کر چکے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت دو ایسے الگ نظامہائے حیات ہیں جو زندگی کے ہر مرحلے پر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ عقیدہ اور عمل کا کوئی ایک جزو بھی ایسا نہیں جس میں ان دونوں کے مابین کسی طرح سے بھی اتفاق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت چیز اسلام ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف یوں تو اہل مغرب کی مختلف تحریروں میں موجود ہے مگر حال ہی میں مشہور مستشرق پروفیسر آربری کے زیر ادارت جو ضخیم کتاب "شرق اوسط میں مذہب" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کو بڑے واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے۔

"سوویٹ حکومت کا مذہب کے بارے میں رویہ زار کی حکومت سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام میں مابعد الطبیعی حقائق پر ایمان چونکہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ حقائق اول روز ہی

سے اشتراکی یورش کا ہدف بنے رہے۔ مگر اشتراکیت کی اسلام دشمنی کی بڑی وجہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عالمگیر دین ہے۔ اسلام کا یہ پہلو اشتراکیت کے نزدیک قدیم کلیسائی نظام سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ جہاں تک نظام حیات ہونے کا تعلق ہے اشتراکیت اسلام کو مسیحت کے کسی فرقے سے کہیں زیادہ خطرناک اور قابل اعتراض خیال کرتی ہے۔ اصلاح مذہب اور نشأۃ ثانیہ کی تحریکات نے مسیحت اور جدید زندگی کے درمیان مصالحت کی راہ پیدا کر دی ہے مگر مسلمانوں کے ہاں کوئی ایسی اصلاحی تحریک نہیں اٹھی جس نے اسلام کو قرون وسطیٰ کے بندھنوں سے آزاد کرایا ہو۔ اس بنا پر سوویٹ رہنما اسے ایک ایسا پرانا اور فرسودہ نظام حیات خیال کرتے ہیں جو مادی ترقی کا دشمن ہے جس کی پہلے مشرقی آمروں اور جاگیرداروں نے پرورش کی اور بعد میں مغربی سامراج نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے سرپرستی کی۔"

اشتراکیت اور اسلام کے مابین بنائے نزاع کی اصل نوعیت سمجھنے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ مختلف مسلم ممالک میں مسلمانوں کو دینی اور سیاسی اعتبار سے تاراج کرنے اور ان کی وحدت کو توڑنے کے لیے اشتراکی عملاً کس قسم کی کارروائیاں کر رہے ہیں۔ ہم اپنی گزارشات کا آغاز حق خودارادیت اور قومی آزادی کی سب سے بڑی علمبردار اشتراکی ریاست روس سے کرتے ہیں۔

روس کا سوویٹ وفاق ۱۶[۱] بڑی جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ ان سولہ جمہوریتوں میں ۸ جمہوریتیں، جن کے نام پہلے گنوائے جا چکے ہیں، خالص مسلم آبادیاں ہیں۔ باقی ۸ میں بھی مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اسی ضمن میں سب سے پہلے روسی ترکستان میں اسلام کا حشر دیکھیے۔ یہ علاقہ دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔

سلہ ۱۔ جمہوریہ ازبکستان۔ ۲۔ جمہوریہ تاجکستان۔ ۳۔ جمہوریہ ترکمانستان۔ ۴۔ جمہوریہ قرغیزستان۔ ۵۔ جمہوریہ قازستان ۶۔ جمہوریہ آذربائیجان۔ ۷۔ جمہوریہ جارجیا۔ ۸۔ جمہوریہ آرمینیا۔ ۹۔ جمہوریہ روسیہ۔ ۱۰۔ جمہوریہ استونیا۔ ۱۱۔ جمہوریہ یوکرین ۱۲۔ جمہوریہ بغدان۔ ۱۳۔ جمہوریہ سفید روسیہ۔ ۱۴۔ جمہوریہ لاٹویا۔ ۱۵۔ جمہوریہ فن لینڈ قریلیا۔ ۱۶۔ جمہوریہ لیتھوانیا۔

مغربی حصہ روس میں شامل ہے اور مشرقی حصہ جسے چینی ترکستان یا سنکیانگ کہا جاتا ہے، چین کے قبضے میں ہے۔ مورخین نے اسی علاقے کو ترکستان بھی لکھا ہے اور ماوراء النہر بھی کہا ہے۔ اس علاقے میں لاتعداد علماء اور فقہاء پیدا ہوئے جن کے علماء کے کارنامے آج تک دینی ادب کا بیش قیمت سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔

اشتراکیت نے عنان اقتدار سنبھالتے ہی ترکستان کے اسلامی اداروں کو بند کیا اور اسلامی تنظیموں کو خلاف قانون قرار دیا، شرعی عدالتیں بھی ختم کر دی گئیں اور مساجد اور مذہبی درسگاہوں کے اوقاف بحق سرکار ضبط کر لیے گئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں ریاست کو کلیسا یا مذہب سے الگ رکھنے کے لیے ایک قانون وضع کیا گیا جس نے مسلمانوں کو دینی اعتبار سے زبردست نقصان پہنچایا۔ اس قانون کے مطابق نماز باجماعت جرم قرار پائی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ نماز میں وہ ساری تقریبات شامل ہیں جن کا دین سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس ترکستان میں سات سو سے لے کر ایک ہزار تک کی آبادی کے ہر محلے میں ایک جامع مسجد، چھ ہزار تین سو سے زائد دینی مکاتب، سو سے زائد ثانوی معیار کے دینی مدارس اور اعلیٰ پیمانے کے دارالعلوم تھے، وہاں چند سالوں میں الحاد اور بے دینی کے بھیانک مناظر سامنے آنے لگے۔ ان مساجد اور مدارس میں لینن کلب اور سرخ چائے خانے قائم ہوئے اور علمائے حق یا تو چن چن کر ہلاک کر دیے گئے یا انہیں بیگار کیمپوں میں رکھ کر ان سے اس قدر مشقت لی گئی کہ وہ لقمہ اجل بن گئے۔

دوسری طرف جگہ جگہ الحادی انجمنیں قائم کی گئیں تاکہ اسلام کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا کیے جائیں۔ روس کے مشہور اخبار پراودا کی ایک رپورٹ کے مطابق، انجمن الحاد کے پاس ۱۹۴۰ء میں مجموعی کارکنوں کی تعداد صرف تاجکستان کے اندر ۲۷ ہزار تھی اور اس کے شہروں میں اس انجمن کی بارہ سو شاخیں کام کر رہی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں ان مختلف شاخوں کے اندر مذہب کے خلاف ڈیڑھ ہزار لیکچر دیے گئے تاجک بستیوں کے اندر ایک ہزار ایسی تقریریں کی گئیں جن میں خدا اور پیغمبر اور دوسری "مذہبی خرافات" کی قلعی کھولی گئی۔[1]

---

[1] پراودا ماسکو شمارہ ۳۱ مئی ۱۹۴۰ء

روس کی اشتراکی حکومت نے ان حربوں کے ساتھ ساتھ ترک آبادیوں کے اندر عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ۲۶ فروری ۱۹۲۶ء میں آذربائیجان کے صدر مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی جسے روسی حکام نے ترک کانفرنس کا عنوان دیا۔ اس میں رسم الخط کی تبدیلی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے پر لینن نے وفورِ جذبات میں کہا: "یہ مشرق کا سب سے بڑا انقلاب ہے اس انقلاب نے ملاؤں کے ہاتھ سے وہ کارگر ہتھیار چھین لیا ہے جس کے ذریعے وہ عوام پر مذہب کا دباؤ ڈالتے رہتے تھے"۔ یہ لاطینی رسم الخط صرف دس سال تک مروج رہا۔ ۱۹۴۰ء میں روسی حکومت نے ایک نئی قرارداد کے ذریعے اسے منسوخ کرکے اس کی جگہ روسی حروف کو رائج کیا۔ رسم الخط کی یہ تبدیلی صرف ترکستان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ تبدیلی مسلم اکثریت کی دوسری ریاستوں یعنی آذربائیجان، جارجیا، اور آرمینیا میں بھی کی گئی۔

مسلمانوں کے عاقبت اندیش طبقے کو شروع ہی سے اس امر کا اندازہ تھا کہ یہ تبدیلی کس ناپاک مقصد کے لیے لائی جارہی ہے۔ اسی بنا پر کانفرنس میں اس تجویز سے اختلاف کیا گیا۔ اور وانگا اورال اور سائبیریا کے وفد کے سربراہ مشہور لغت دان کلیم جان ابراجیموف اور باشکری وفد کے قائد شارہیوف نے ان خطرات کی نشاندہی کی جو اس تبدیلی میں مضمر تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر جب مختلف وفود واپس گئے تو انہوں نے ایک یادداشت میں عربی رسم الخط کی تنسیخ پر فریاد کی۔ مگر اس فریاد کا یہ اثر ہوا کہ تعلیمی اداروں اور سوویتی مصنفین کی یونین سے ان تمام عناصر کو نکال دیا گیا جنہوں نے اس تجویز کی ذرا بھی مخالفت کی تھی۔ جن لوگوں نے ذرا کھل کر احتجاج کیا انہیں قید میں ڈال دیا گیا۔ اس جرم کی پاداش میں کلیم ابراجیموف کو جو ۱۹۱۸ء سے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن چلے آرہے تھے قید و بند کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں جہاں قازان جیل میں ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جمہوریہ تاتار کے ناظم تعلیمات اسحاق قزاقوف اور سلطان گالف کو بھی اس اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑی۔ اس تبدیلی کا نتیجہ وہی نکلا جس کا مسلمانوں کو اچھی طرح احساس تھا یعنی نئی نسل اپنے دینی تصورات اور احساسات سے یکسر بیگانہ ہوگئی اور ماضی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ اس کے نزدیک ردی کے ڈھیر سے زیادہ کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ عربی رسم الخط میں چھپی ہوئی تمام کتابیں جمع کی گئیں اور انہیں غیر مفید قرار دے کر

یا جلا دیا گیا اور یا کاغذ سازی کے کارخانوں کی تحویل میں دے دیا گیا تاکہ ان انباروں کو کاغذ بنانے کے لیے استعمال میں لے آئیں۔

روس میں دینی لٹریچر کا کیا حشر ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اشتراکی انقلاب سے پیشتر روس میں ۲۳ مسلم پریس، اٹھارہ مذہبی جرائد اور ۱۹۶ ایسے کتب خانے تھے جو دینی ادب کی ترویج اشاعت کا کام کرتے تھے۔ مگر اب بدقسمتی سے وہاں کوئی ایک پریس بھی ایسا باقی نہیں رہا جس میں اسلامی لٹریچر شائع کیا جاتا ہو۔ ۱۹۴۸ء کے بعد بڑی مشکل سے صرف قرآن مجید کی طباعت کی اجازت ملی ہے اور اسے روسی حکومت کی بہت بڑی فیاضی سمجھا گیا ہے۔ سرکاری کاغذات میں عربی میں شائع ہونے والے دو جرائد کا ذکر بھی ملتا ہے مگر ان میں سے کسی ایک رسالے کی کوئی کاپی باہر کی دنیا نے نہیں دیکھی۔ سوویٹ روس کی سرزمین ایسے کتب خانوں سے یکسر خالی ہے جو دینی لٹریچر کے لیے وقف ہوں۔ حال ہی میں ایک پاکستانی اشتراکی نے تاشقند میں امور مذہبی کے تحت ایک ایسی لائبریری کا انکشاف کیا ہے جس میں کل آٹھ ہزار کتابیں ہیں۔ ان میں عربی کتب کی تعداد صرف ڈھائی سو ہے۔[۵۱]

اسی سلسلے میں ایک نگاہ اس طبقے کی مظلومیت پر بھی ڈال لیجیے جسے اشتراکیت کے ہاتھوں سب سے زیادہ مظالم سہنے پڑے۔ اشتراکیوں کا یہ طرز عمل ان کے مذہب دشمن مزاج کے عین مطابق ہے۔ چونکہ اس نظام کی ساری بنیاد ہی الحاد اور مادیت پر رکھی گئی ہے اور اس کا مقصد ہی دنیا میں لادینیت کا فروغ اور تسلط ہے اس لیے اس کے جبر و استبداد کا سب سے زیادہ نشانہ وہی لوگ بنتے ہیں جو دینی تعلیمات کے امین کہلاتے ہیں۔ اشتراکیوں نے دنیا کے ہر ملک میں علماء اور مذہبی طبقوں کو ہی خاص طور پر اپنے ظلم کا تختہ مشق بنایا ہے۔ ترکستان میں قانون تعزیرات کی دفعہ ۵۰ کے تحت علماء کو تمام شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا اور ان میں سے ایک کثیر تعداد کو یہ کہہ کر جیلوں میں ٹھونس دیا گیا کہ یہ عوام کو اشتراکی نظام کے خلاف اکساتے ہیں۔ بحر ابیض کی نہر کی

---

۵۱ RELIGION IN MIDDLE EAST VOL II P 157-15

کھدائی کے لیے روسی حکام نے جن قیدیوں کو بیگار کے طور پر بھیجا ان کے اندر کثیر تعداد اُن حق پسند علماء کی تھی جنہیں جلاوطنی کی سزائیں ملی تھیں۔ آذربائیجان میں نامور علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد کو روسی سفاک حاکم یبنیروف نے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان شہداء میں آغا علی زادہ، باکو کے قاضی میر محمد کریم، شیخ حسن، شیخ غنی، ملا تقی اصفہانی ولد عبداللہ، اور شیخ عبدالغنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جو علماء پھانسی سے بچ گئے ان کے خلاف نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع سے نہایت شرمناک پراپیگنڈا کر کے انہیں معاشرے میں ذلیل اور رسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تصویروں اور کارٹونوں کی مدد سے انہیں طفیلی اور مفت خورے ظاہر کیا گیا۔ تھیٹروں میں ان کے خلاف ڈرامے اسٹیج ہوئے اور افسانوں اور کہانیوں کی مدد سے انہیں انسانیت کے بدخواہ کے طور پر پیش کیا گیا اور مسلم قوم کی نوخیز نسل کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس طبقے کو تم اپنا رہنما سمجھتے ہو اور جس کی طرف تم رشد و ہدایت کے لیے رجوع کرتے ہو وہ تو چوروں اور ڈاکوؤں کا ایک خطرناک گروہ ہے جو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر تمہیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے لوٹتا رہا ہے۔ اب وقت ہے کہ تم ان سے پوری طرح انتقام لو اور انہیں مٹانے میں حکومت کا ساتھ دو۔ یہ اسی غلط پراپیگنڈے کا اثر تھا کہ بعض مقامات پر مزدور یونینوں نے مسجدیں بند کرنے اور انقلاب دشمن مولویوں کو عبرتناک سزائیں دینے کی قرار دادیں پاس کیں۔

اشتراکیت کی مذہب دشمنی کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس نے بڑی چالاکی اور عیاری سے علماء کو علماء کے ہاتھوں برباد کروایا۔ اس نے سب سے پہلے ایک لگی بندھی سازش کے تحت علماء اور عوام کو یہ تاثر دیا کہ اشتراکیت کے علمبردار اُن علماء کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں جو غریبوں اور بے کسوں کے حامی ہیں اور پسے ہوئے طبقوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے انقلاب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ انہیں اگر دشمنی ہے تو علماء سو سے ہے۔ علماء سو سے اشتراکیوں کی مراد وہ علماء ہیں جو مادیت پرستی کے اس طوفان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جن کی بصیرت کی آنکھوں کے سامنے مذہب، اخلاق اور روحانیت کی بربادی بالکل عیاں ہے۔ اشتراکیت کے علمبردار علماء سو کی جو تعریف کرتے ہیں اُسے اگر وسیع کیا جائے تو ان کے نزدیک وہ سارے مسلمان علماء سو اور سرمایہ داروں اور

استعمار پرستوں کے ایجنٹ ہیں جو اشتراکیت کے دل وجان سے حامی نہیں خواہ وہ استعماریت اور سرمایہ داری کے بھی اتنے ہی مخالف ہوں جتنے کہ اشتراکیت کے، مگر اسے مسلم قوم کی بدقسمتی سمجھئے کہ علماء کا ایک گروہ اشتراکیت کی اس ناپاک سازش کا شکار ہو گیا اور اُس نے حالات کو سمجھے بغیر خود اشتراکیوں کا آلہ کار بن کر دین اور علماء کی بربادی کا سامان کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکیت کے زیرِ دام آنے والے علما کی ایک اچھی خاصی تعداد وہ تھی جسے اس انقلاب کی تباہ کاریوں اور اشتراکیت لوازِ طرزِ عمل کے نتائج کا آغاز میں کوئی اندازہ نہ تھا مگر عالم واقعات میں جب اس کے نتائج سامنے آئے تو انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ یہ تحریک جسے وہ اپنی دانست میں مظلوک الحال طبقوں کو سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات دلانے کی تحریک سمجھ رہے تھے درحقیقت اسلام اور روحانی اقدار کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے اس احساس کے بعد ان علماء میں سے بعض نے اس کا راستہ روکنے کی سرتوڑ کوشش کی اور اس مقصد کی خاطر جان تک کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کی مگر فتنے کا جو طوفان سیل بے پناہ بن کر امڈ چکا تھا اِن لوگوں کی کوششوں سے آخر کب تھم سکتا تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

صبح سمرقند کے مصنف نے ایک فریب خوردہ عالم فخرالدین حدیو کی اشتراکیت کے بارے میں خوش فہمی کا یوں ذکر کیا ہے۔

"میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہمارے ملک میں امن و آشتی قائم کر کے اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ زدوں کا دستگیر اور کفیل ثابت کر دیا ہے۔ حکومت نے یہ چیز لازم سمجھی ہے کہ غریب طبقے میں تمام زمین بانٹ دی جائے۔ حکومت کے اس فعل پر میں اسے دعا دیتا ہوں یہ فعل عین نبی کی سنت ہے۔

مگر یہ "اصلاحی تحریک" جب ابتدائی مشکلات پر غالب آنے میں کامیاب ہوئی تو اس کے علمبرداروں نے لوگوں پر اس کی اصل حقیقت آشکارا کرتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں کہا:

بعض تعلیم یافتہ ترک (آذربائیجان کے ترکمان) اس وہم میں مبتلا ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سوشلسٹ تھا اور مارکس اور اینجلز اور لینن نے اپنے افکار قرآن سے اخذ کیے ہیں ہماری

(باقی بر صفحہ ۶۱)

بقیہ اشارات

پارٹی کے اندر ایسے سادہ لوح لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو اس خوش فہمی میں ہیں کہ ہم اب بآسانی قرآن کے احکام کے مطابق اپنی روزانہ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ ان حضرات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ ۸ سال کے اندر انہوں نے اپنے ابتدائی اسباق بھی اچھی طرح ذہن نشین نہیں کیے۔ اسلام تاجرانہ سرمایہ داری کا نام ہے۔ اسلام جاگیرداری کا ستون ہے۔ اسلام نے مسلم اقوام اور متمدن اقوام کے مابین دیوارِ چین حائل کر رکھی ہے۔ یہ مسلمان کی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں ہے اس نے مسلمانوں کے اندر متمدن زندگی اختیار کرنے کا شوق پامال کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی مبہم تعلیمات کے تحت جتنی اسلامی ریاستیں وجود میں آئی ہیں ان کا مزاج تمام تر قرونِ وسطی کی خرافات سے ہم آہنگ ہے یہ ریاستیں یورپی سامراج کی گرفت میں ہیں۔ اسلام نے انسانوں کو غلامی کا سبق دیا ہے۔ قرآن کیا ہے، شخصی ملکیت اور انفرادی سرمایہ داری کا آئینہ ہے [1]

(باقی)

---

[1] یہ ایک تقریر کا اقتباس ہے جو ایک نام نہاد مسلمان مصطفی کولیف نے اجتماعی فارم کی طرح ڈالنے سے پہلے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کے ایک اجتماع میں کی تھی۔ اخبار کمیونسٹ باکو، آذربائیجان۔ شمارہ بابت ۲۶ جون ۱۹۲۸ء